پروفیسر رشید احمد

شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی بھی اسلام کی کشتی منجدھار میں پھنسی پردۂ غیب سے اس کی ناخدائی کے لیے کوئی نہ کوئی مردِ باصفا باہر آیا اور ساحل تک پہنچا کر اس نے دم لیا۔ برِعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں پر بھی کم از کم دو مواقع ایسے آئے جب کہ ہر شخص کو اپنی اپنی جگہ اس بات کا یقین تھا کہ اسلام کا ان خطرات سے جانبر ہونا ممکن نہیں ہے لیکن دونوں بار فاروق اعظمؓ کی اولادِ امت کی پشت پناہ ثابت ہوئی۔ پہلی مرتبہ اسلام کو تمدنی اور سماجی خطرہ لاحق تھا جب کہ شہنشاہِ اکبر دینِ الٰہی کی ترویج کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ اگرچہ اکبر کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی تاہم اس کے اثرات دور رس ثابت ہوئے اور مسلمانوں میں غیر اسلامی بلکہ مشرکانہ رسوم عام ہو گئیں۔ اس موقع پر مجدد الف ثانی نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ دوسرے موقع پر ہندی مسلمان سیاسی اور اقتصادی خطرات سے دوچار تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد اپنے اور پرائے سب ہی مغلیہ سلطنت کو ختم کرنے کے لیے میدان میں اتر آئے اور نااہل بادشاہوں اور غدار وزیروں نے مغل حکومت کی جڑ کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ دہلی اور اس کے اطراف بار بار کی خونریزیوں کے باعث لالہ زار بن گئے۔ شمالی اور وسطی ہندوستان سکھوں اور مرہٹوں کی چیرہ دستیوں کا شکار بنا ہوا تھا۔ جنوبی اور مشرقی علاقے یورپی اقوام کے زیر نگین آ چکے تھے۔ یہ تو خیر غیر ہی تھے خود مسلمان اسلامی شعار سے منحرف ہو کر ایرانی اور تورانی لبادہ اوڑھ کے ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ نام نہاد علماء فتنہ و فساد برپا کرنے میں پیش پیش تھے اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اختلافات پیدا کر کے متخاصم گروہ تیار کر دیئے تھے۔ کتاب و سنت اور حدیث و فقہ کے مسائل پر تند و تیز بحثیں تلخی و عداوت پیدا کر دیتی تھیں اور اکھاڑہ نما مناظروں کا نتیجہ ہاتھا پائی کی شکل میں نکلتا تھا۔ یہ علماء صرف اس بات پر متفق تھے کہ عوام کو جاہل اور اسلامی تعلیمات سے غافل رکھا جائے تاکہ ان کی مذہبی اجارہ داری باقی رہے۔

اٹھارویں صدی کے اوائل کے یہ حالات تھے اور ان حالات میں ایک زبردست مصلح پردۂ ظہور پر آیا جس کا نام شاہ ولی اللہ تھا، اور اسے بھی نسل فاروقی میں ہونے کا فخر حاصل تھا۔ شاہ ولی اللہ نے باہمی اختلافات کا خاتمہ کر دیا۔ وہ تمام نزاعات جن کی وجہ سے مسلمان باہم دست و گریبان تھے ختم کر دیئے۔ اسلامی علوم کو جن پر ہوس پرستوں کا غاصبانہ قبضہ تھا عوام کے لیے سہل الحصول بنا دیا۔ جس سے صدیوں کا جمود ختم ہو گیا اور

اسلامی روح ایک بار پھر نکھر آئی ۔

حالاتِ زندگی

صدیوں سے دلّی میں ایک نہایت معزز اور موقر خاندان آباد تھا جس کے افراد زہد و ریاضت، علم و فضل اور تقویٰ و صداقت کے لیے مشہور تھے ۔ اس خاندان کے افراد سلاطین کے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور کئی پشتیں اربابِ سیف و قلم اور صاحبانِ جبہ و دستار کی گزری تھیں۔ اسی خاندان سے عبدالرحیم کا تعلق تھا جو اپنے زمانے کے جیّد عالم سمجھے جاتے تھے۔ جنھوں نے دینی علوم کی اشاعت کے لیے دہلی میں "رحیمیہ" نامی ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس میں وہ خود تشنگانِ علوم کو سیراب کیا کرتے تھے ۔ عبدالرحیم ہی کے گھر کبر سنی میں ایک بچہ تولد ہوا ۔ اس کی ولادت کی بشارت حضرت قطب الدین بختیار کاکی نے خواب کے ذریعے دی تھی ۔ اس خواب میں دی ہوئی ہدایت کے مطابق اس نو مولود بیٹے کا نام شاہ عبدالرحیم نے قطب الدین رکھا لیکن اس نام نے زیادہ شہرت نہیں پائی اور ولی اللہ کا نام لوگوں کی زبان پر جاری ہوگیا۔ ان کی ولادت کی تاریخ ۴ر شوال ۱۱۱۴ھ مطابق ۲۱ر فروری ۱۷۰۳ء ہے ۔

پانچ سال کی عمر میں شاہ صاحب کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ معلمی کے فرائض والد ہی نے انجام دیئے ۔ انہوں نے دو سال کے اندر قرآن مجید ختم کر لیا اور دس سال کے قلیل عرصے میں معقولات و منقولات پر پوری دستگاہ حاصل کر لی۔ حدیث، تفسیر، فقہ، معانی، کلام، ادب، فلسفہ اور منطق کے علاوہ طب، ہیئت اور ریاضی میں انہیں مہارت تامہ حاصل ہوگئی۔ علوم ظاہری پر عبور حاصل کرنے کے بعد علوم باطنی کی طرف مائل ہوئے۔ اس میں بھی والد ہی ان کے مرشد بنے ۔ پندرہ سال کی عمر میں والد کے ہاتھ پر نقشبندی طریقہ کی بیعت کی۔ دو سال کے بعد ہی والد مشفق کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ شاہ صاحب بارہ سال تک مدرسہ رحیمیہ کی مسندِ تدریس پر رونق افروز رہ کر دینی اور عقلی علوم کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین کا قصد فرمایا جہاں دو بار حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے علاوہ روایت حدیث کی سند بھی حاصل کی اور طریقت کے خرقے بھی لیے۔ ۱۱۴۵ھ میں وطن واپس آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مرہٹوں کی یورش سے ہندی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ ان کے مظالم کے باعث خلق اللہ پریشاں حال تھی۔ شاہ صاحب ہی کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ پانی پت کے مقام پر احمد شاہ ابدالی نے ہمیشہ کے لیے مرہٹوں کی قوت توڑ دی (۲)۔

شاہ صاحب کا انتقال ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۳ء میں ہوا۔ شمسی سال کے حساب سے آپ نے صرف ساٹھ سال کی عمر پائی ۔ لیکن وہ دور دیکھا کہ تاریخِ ہند میں ایسا پُرآشوب دور شاید ہی کوئی ہو۔ آپ عالمگیری عہد کے آخری ایام میں پیدا ہوئے اور دس سلاطین کا زمانہ پاکر شاہ عالم ثانی کے عہد میں انتقال فرمایا۔ اس طوائف الملوکی

کے علاوہ آپ نے سادات بارہا کے اقتدار و تسلط کو بھی دیکھا جن کے مظالم کا شکار صرف عوام ہی نہ تھے بلکہ سلاطین مغلیہ پر بھی انہوں نے ظلم کے پہاڑ توڑے۔ مرہٹوں کا عروج اور زوال بھی ان کی آنکھوں دیکھی بات تھی۔ سکھوں کی سفاکیاں بھی ان کے زمانے کا واقعہ ہے۔ نادر شاہ کا دہلی پر حملہ اور باشندگانِ دہلی کا قتلِ عام ان کے چشم دید واقعات ہیں۔ ایرانی اور تورانی امراء کی باہمی رسہ کشی شاہ صاحب ہی کے زمانے میں زوروں پر تھی۔ ان سیاسی حالات نے مسلمانوں کے عقائد و اخلاق کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کا معاشی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ تھے شاہ ولی اللہ کے زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات۔

تصانیف

شاہ ولی اللہ بہت سی باتوں میں امام غزالی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جس طرح امام صاحب نے ۵۵ سالہ زندگی میں مختلف علوم پر گرانمایہ تصانیف لکھیں اسی طرح شاہ صاحب نے بھی بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے امام غزالی کی بہ نسبت چند سال زیادہ عمر پائی لیکن شاہ صاحب کے پنجے نجف خاں کے حکم سے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیئے گئے تھے۔ یہ کس سن کا واقعہ ہے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح ان کی عمر تقریباً امام غزالی کے برابر رہ جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ولی اللہ کا زمانہ جس قدر پُرآشوب تھا اس کا عشرِ عشیر بھی غزالی کا نہ تھا۔ شاہ صاحب کو آئے دن کے سیاسی انقلابات کی وجہ سے بھی سکونِ قلب نصیب نہیں تھا جو تصنیف اور تالیف کے لیے اشد ضروری ہے۔

دنیا میں کم ہی ایسے مصنفین گزرے ہیں جن کی کتابیں تعداد اور پایہ دونوں لحاظ سے قابلِ قدر ہوں۔ شاہ صاحب ایسے مصنفین کی صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔ علومِ شرعیہ میں شاید ہی کوئی علم ہو جس پر شاہ صاحب کی کوئی نہ کوئی گرانمایہ تصنیف موجود نہ ہو۔ ان تصانیف میں سب سے زیادہ اہم قرآن کریم کا فارسی ترجمہ "فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن" ہے۔ سرزمین ہند میں مسلمانوں کی حکومت ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے قائم تھی لیکن اس سے قبل کلام اللہ کو کسی بھی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ مبارک خدمت کاتبِ تقدیر نے شاہ صاحب کی قسمت میں لکھی تھی۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی ایک تہلکہ مچ گیا۔ آپ پر قاتلانہ حملہ بھی کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس ترجمہ سے عوام کے لیے قرآن فہمی کے دروازے کھُل گئے۔ قرآنی مضمرات کی وضاحت کے لیے آپ نے اصولِ تفسیر پر ایک مختصر رسالہ بھی تصنیف فرمایا جس کا نام فوز الکبیر رکھا۔ حدیث کی کتابوں میں آپ کو سب سے زیادہ موطأ امام مالک پسند تھی۔ اس کی آپ نے دو شرحیں مصفیٰ اور مسویٰ لکھیں۔ اس سے قبل لوگ قرآن و احادیث کی بجائے عمر کا بیشتر حصہ فقہ کی تحصیل میں صرف کر دیا کرتے تھے۔ تصوف میں بھی الدر الثمین، سطعات، القول الجمیل، ہمعات، لمعات آپ کی بڑی نادر کتابیں ہیں۔

لیکن ہمیں سر دست شاہ صاحب کی انہیں تصانیف سے سروکار ہے جن کا موضوع سیاسیات ہے۔ اس سلسلے کی کتابوں میں حجۃ اللہ البالغہ کا نام سرِ فہرست ہے جس میں انسانی معاشرے کی ابتدا سے لے کر کامل معاشرہ تک کے مختلف مراحل سے بحث کی گئی ہے۔ پھر ان مختلف ادوار میں جو سیاسی تقاضے ہوتے ہیں ان پر روشنی ڈال کر بادشاہ کے اوصاف و شرائط نیز خلافت کی ضرورت وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ولی اللہی تصانیف میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ سیاسیات پر دوسری قابلِ قدر کتاب الخیر الکثیر ہے جو مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے۔ اس میں اسلامی ریاست کے اصول زیرِ بحث آئے ہیں۔ البدور البازغۃ میں بھی اسرارِ شریعت کے ساتھ بعض سیاسی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء میں بھی خلافت کے متعلق شاہ صاحب کے اہم افکار ملتے ہیں جس میں خصوصیت کے ساتھ خلافت اور خلفائے راشدین کی حیثیت سے بحث ہوئی ہے۔ اسی موضوع پر فارسی میں ایک کتاب قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین لکھی جس میں بعض سیاسی تصورات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

اسلوبِ بیان وطرزِ استدلال

شاہ صاحب کے اسلوبِ بیان میں بڑی ندرت پائی جاتی ہے۔ آپ نے مخاطبین کی سمجھ واستعداد کے مطابق کلام کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ جب ایسے مسائل جن کا تعلق براہِ راست عوام سے ہے بیان کئے گئے تو نہایت عام فہم اور سلیس زبان اختیار کی۔ اس کی عمدہ مثال ازالۃ الخفاء ہے جس کی زبان سہل ممتنع کہلانے کی مستحق ہے پھر وہ عوام تک اپنے خیالات پہنچانے کے لیے عربی کے علاوہ فارسی کو بھی ذریعہ بناتے ہیں جو اس زمانے میں سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے عام طور پر بولی، لکھی اور سمجھی جاتی تھی۔ برخلاف اس کے جب ایسے مسائل جن کا تعلق خواص سے ہوتا زیرِ بحث آتے تو اس کی زبان دقیق اور اعلیٰ ہوتی۔ آپ کی تصوّف کی کتابیں جن میں دقیق نکات بیان ہوئے ہیں زبان کے اعتبار سے زود فہم نہیں ہیں۔ بایں ہمہ ان کے بیان میں جادو کا اثر ہے جو پڑھنے والوں کے قلوب کو مسحر کر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا مناظر احسن گیلانی کا قول نقل کرنا بے محل نہ ہوگا وہ فرماتے ہیں:

> "عربی زبان میں انہوں (شاہ صاحب) نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشا کی جو ان کا مخصوص اسلوب ہے پوری پابندی کی ہے۔ شاہ صاحب نے عربی انشا و ادب کا جو نیا قالب تیار کیا ہے یہی نہیں کہ ہندوستانی مصنفین میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی بلکہ جہاں تک میری محدود رسائی کا تعلق ہے میں نہیں جانتا کہ آغازِ اسلام سے اس وقت تک کسی اسلامی علاقہ کے اربابِ تصنیف نے اس کو اختیار کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ شاہ ولی اللہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر صاحب "جوامع الکلم" "النبی الخاتم" صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ گفتگو کی پیروی کی ہے۔ حتی الوسع وہ اس

کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاوروں میں کریں جو لسانِ نبوت اور زبانِ رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس میں خدا نے ان کو خاص مہارت عطا فرمائی ہے۔ ان سے پہلے تو کسی کو عبارت کے اس ڈھنگ کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے بعد بھی اس کی تقلید آسان نہیں ہے۔ حدیث کے بعد ان کی عبارت میں قرآنی طرزِ تکلم کا بھی اثر ہے لیکن قرآن سے زیادہ اس باب میں وہ حدیث ہی کے متبع نظر آتے ہیں اور اسی چیز نے ان کی کتابوں کے رنگ کو عربی زبان کے تمام دوسرے مصنفین سے ممتاز کر دیا ہے۔"

شاہ صاحب کے اسلوب میں جدت اور ندرت کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی عبارتیں حشو وزوائد سے پاک ہیں۔ آپ نے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پر بھی کتابیں لکھیں لیکن ان پر چند ہی صفحات میں سیر حاصل بحث کر لی حتیٰ کہ ایک پہلو بھی نظر انداز نہ ہو سکا۔ ان کی تصانیف جامعیت اور اختصار کا عجیب وغریب مرقع ہیں۔ اس کی مثال میں بالخصوص الفوز الکبیر فی اصول التفسیر اور الانصاف فی سبب الاختلاف کو بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک میں تفسیر کے تمام رموز بیان ہوئے ہیں اور دوسری میں فقہی مسائل میں اختلافات کے اسباب بیان کر کے تطبیق کی صورتیں بتلائی گئی ہیں۔ ایک طرف ان کتابوں کے موضوع پر غور کیجئے اور دوسری طرف یہ خیال فرمائیے کہ ان کی ضخامت مشکل سے پچاس صفحات کے اوپر ہو گی۔

اپنے سیاسی افکار کے استدلال میں قرآنی آیات اور فرمودات نبوی سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں۔ مثلاً جہاد اور خلافت کے تعلقات کی وضاحت کے لیئے ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ پیش کی ہے۔ یا شرائط خلافت کے اثبات کے لیے سورہ نور سے آیاتِ ربانی وعد اللہ تا الفاسقون نقل کی ہیں بلکہ وہ درمیان عبارت میں نہایت بے تکلفی کے ساتھ قرآنی تراکیب اور آیات کے ٹکڑے جا بجا استعمال کر جاتے ہیں قرآن مجید سے بھی زیادہ وہ احادیث سے دلائل لاتے ہیں۔ مثلاً نااہل لوگوں کے سپرد عنانِ حکومت کرنے سے منع کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ نقل کرتے ہیں جو آپؐ نے ایرانی ملکہ کی تخت نشینی کی خبر سن کر فرمائے تھے "جس قوم نے اختیاراتِ حکومت ایک عورت کے سپرد کر دیئے ہیں وہ کبھی فلاح نہیں پائے گی"۔ یا اطاعتِ خلیفہ کے وجوب پر اس حدیث سے استدلال فرماتے ہیں کہ "چاہے خلفا کو تم پسند کرو یا نہ کرو لیکن ان کا حکم بہر حال سننا اور ماننا ہو گا جب تک وہ ایسی بات کا حکم نہ دیں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے جب وہ ایسی بات کا حکم دیں تو پھر ان کا حکم نہ سنو اور نہ ہی ان کی اطاعت کرو"۔

شاہ صاحب اپنے دلائل میں آثار صحابہ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر عمال حکومت کو تنخواہ لینے کے جواز میں حضرت ابوبکرؓ کا بیت المال سے وظیفہ وصول کرنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ فقہاء

کے اقوال کو بھی بطور سند پیش کرتے ہیں ۔ خلافت کو آپ بیع سلم سے تشبیہہ دیتے ہوئے فقہا کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ جس غلہ کے متعلق بیع سلم کی گئی ہو اس کے ساتھ یہ شرط نہ لگائی جائے کہ فلاں چھوٹی آبادی کی پیداوار دی جائے گی کیونکہ عین ممکن ہے کہ وہ پیداوار اس بستی سے حاصل نہ ہو سکے ۔ یہی قباحت خلافت کو ایک خاندان کے ساتھ مخصوص کر دینے میں ہے ۔ کہ شاید اس خاندان سے ان صفات کا حامل خلیفہ نہ دستیاب ہو سکے ۔ شاہ صاحب اپنے تصورات کی وضاحت کے لیے قدیم شعراء کا کلام جن کا زہد و تقویٰ مسلم ہے پیش کرتے ہیں ۔ وہ بادشاہ کو جہاں یہ تاکید کرتے ہیں کہ مجرموں کو سزا دینے میں تساہل نہ برتے ۔ وہ سعدی شیرازی کا یہ شعر نقل کرتے ہیں :

اگر پروری گرگ یوسف درد چو گربہ نوازی کبوتر خزرد

استدلال کے لیے شاہ صاحب تاریخی واقعات بھی بیان کرتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے ۔ وہ مسلم اور غیر مسلم ، قدیم اور جدید تاریخوں سے یکساں طور پر اقتباسات پیش کرتے ہیں ۔ وہ جہاں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تمدن کا اثر سیاست پر بہت گہرا پڑتا ہے کیونکہ تمدنی ترقی حکمراں جماعت کو آرام و آسائش کا دلدادہ بنا دیتی ہے جس سے معاشرہ کا اکثر حصہ حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو خداوند تعالیٰ انسانیت کو ایسی مصیبت سے نجات دلانے کے لیے انقلاب کے سامان پیدا کر کے اس حکومت کا خاتمہ کر دیتا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی مثال دیتے ہیں جنہوں نے تمدنی ترقی کی وجہ سے آرام و آسائش کو مقصدِ حیات بنا لیا تھا اس لیے ان کے خاتمے کے لیے عربوں میں رسول اللہ صلعم کو پیدا کیا گیا ۔ فرعون کی ہلاکت کی طرف بھی اسی سلسلے میں اشارہ کرتے ہیں ۔ اور ہم عصر حالات کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔

شاہ صاحب کے دلائل میں مابعد الطبیعاتی رجحانات کے ساتھ ساتھ مشاہدات اور تجربات کو بھی خاصا دخل ہے ۔ ان کی دلیلیں استقرائی اور استخراجی دونوں ہیں گویا کہ وہ مشائی اور اشراقی مکاتیبِ فکر کے سنگم ہیں ۔ مثلاً وہ انسانی اجتماعی اداروں کے متعلق غور و خوض کرنے کے لیے استقرائی دلائل دیتے ہیں اور اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ ان اداروں کے قیام کے محرکات کیا تھے ۔ پھر ازمنہ قدیم کی تاریخ کو سامنے رکھ کر اس امر کا جائزہ بھی لیتے ہیں کہ یہ اجتماعی ادارے کب وجود میں آئے اور انہوں نے وقتاً فوقتاً کیا کیا روپ دھارے گویا کہ وہ زمانہ گزشتہ کے تجربات اور اپنے مشاہدات کو بروئے کار لا کر اجتماع انسانی کا جائزہ لیتے ہیں ۔ اس طرح ان کے دلائل میں عینیت پسندی (Idealism) اور حقیقت پسندی (Realism) کا عجیب و غریب امتزاج پایا جاتا ہے ۔ وہ خود کہتے ہیں کہ " کامل وہ ہے جو جزء سے کل تک پہنچے اور کل سے

جزو پر آئے اور دونوں کے تضاد کو دور کرے۔"

ولی اللہ وحدت الوجود پر عقیدہ رکھتے تھے۔ کثرت میں بھی وحدت پر ان کا ایمان تھا اسی لیے ان کے افکار میں بلا کی جامعیت پائی جاتی ہے۔ وہ مختلف فیہ مسائل میں اپنی ذہانت اور خداداد قابلیت کے ذریعہ ایسی راہ نکال لیتے ہیں جس پر متخاصم گروہ متفق ہو سکیں۔ ان کی حنفی اور شافعی اختلافات میں تطبیق، شریعت اور طریقت کے امتیازات کا خاتمہ، حدیث و فقہ کا اتحاد شاہ صاحب کی جامعیت کی بہترین مثالیں ہیں۔

اہل دین اور اہل عقل کے طریقوں کو اس طرح اپناتے ہیں کہ قرآن و احادیث کے اشارات و اجمالات کی توضیح و تشریح بھی قدیم و جدید فلسفہ سے کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "اہل دین کا یہ حال ہے کہ وہ کلی تصورات پر اکتفا کئے بیٹھے ہیں اور دوسری طرف اربابِ عقل کا گروہ ہے جو جزویات میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ دونوں غلطی پر ہیں دونوں کی حقیقت تک رسائی نہیں۔"

شاہ صاحب، قرآن و احادیث اور فلسفیانہ دلائل پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے نکات کو ذہن نشین کرانے کے لیے عام فہم مثالیں بھی دیتے ہیں۔ وہ بادشاہ کو فوجیوں کی تربیت کی طرف توجہ کرنے کی تاکید کرتے ہیں تو فوجی تربیت کو گھوڑے کے سدھانے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جس طرح سوار گھوڑے کی تمام چالوں اور عیوب سے واقفیت رکھتا ہے اور اسے ان طریقوں کا بھی علم ہوتا ہے جن کے ذریعہ سے سرکش سے سرکش گھوڑا اس کے تابع بن جائے اور وہ نہ تو گھوڑے کے ساتھ بے حد نرمی برتتا ہے اور نہ ہی اسے دھڑا دھڑ کوڑے لگاتا ہے بجنسہ بادشاہ کو فوج کے ساتھ سلوک روا رکھنا چاہیئے۔

سیاسی نظریات

اجتماعی معاشرہ

شاہ ولی اللہ نے حیوانات کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک ایسے جانور جو زمین میں پیدا ہوتے ہیں انہیں فطرت غذا حاصل کرنے کا طریقہ تو سکھلاتی ہے لیکن ان میں جنسی میلان نہیں پایا جاتا اور نہ ہی انہیں اولاد کی پرورش میں کسی قسم کی جدوجہد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے یہ جانور اجتماع پسند نہیں ہوتے۔ لیکن جانوروں کی ایک اور قسم ہوتی ہے جن میں توالد و تناسل کا سلسلہ ہوتا ہے۔ پیدائش اور پرورش میں نر و مادہ مل جل کر کام کرتے ہیں انہیں فطرت تدبیر منزل کا طریقہ بذریعہ الہام سکھلاتی ہے۔ ان ہی الہامات کے نتیجہ کے طور پر اجتماع وجود میں آتا ہے۔ وہ شہد کی مکھیوں اور پرندوں کے اجتماع کی مثال دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ شہد کی مکھیاں مناسب درخت تلاش کرتی ہیں، مل جل کر چھتہ بناتی ہیں، ایک ساتھ رہتی ہیں اور اجتماعی مفاد کے لیے ایک مکھی کا

حکم مانتی ہیں۔ اسی طرح پرندوں میں بھی گھونسلا بنانے، جفتی کرنے، انڈے سینے، بچوں کی پرورش اور ان کو خطرات سے بچانے کے لیے نر و مادہ میں باہمی تعاون ہوتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان بھی اپنی حیوانی ضروریات ـــــ حفاظتِ نفس اور بقائے نسل ـــــ کی خاطر اجتماع کا محتاج ہے۔ بلکہ دیگر حیوانات کے مقابلہ میں انسان دوسروں کا زیادہ دست نگر ہے۔ کیونکہ اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل بھی اتنی آسان نہیں جتنی دیگر جانوروں کی ہے۔ جانور تو گھاس کھاکر اور درختوں کے کچے پھل چباکر پیٹ بھر سکتے ہیں اور پھر وہ اپنی موٹی کھال اور لمبے لمبے بالوں کے ذریعہ سردی گرمی سے خود کو بچا سکتے ہیں۔ لیکن انسان ایسا نہیں کرسکتا ہے کیونکہ ایک طرف اس کا معدہ گھاس پھوس کا متحمل نہیں ہوسکتا اور دوسری طرف موسم کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے خارجی اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید بر اں اس کی خواہشات کی تکمیل میں جغرافیائی حالات بھی سدِ راہ بن جاتے ہیں۔ قدرت نے انسان کی ان کوتاہیوں کی تلافی اس طرح کردی ہے کہ ان کو اپنے ابنائے جنس سے ملنے کی فطری خواہش عطا کی نیز انہیں قوتِ گویائی مرحمت فرماکر ایک دوسرے سے قریب تر کردیا ہے ان دونوں نعمتوں سے دیگر حیوانات محروم ہیں۔ اس طرح انسان ایک طرف فطرتاً جماعت پسند ہے تو دوسری طرف اس کی بنیادی ضروریات ایک دوسرے کو قریب تر ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔

شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں کہ انسانوں میں حفاظتِ نفس اور بقائے نسل جیسی حیوانی بنیادی خواہشات کے علاوہ کچھ اس کی خصوصی ضروریات بھی ہوتی ہیں جن سے دیگر حیوانات عاری ہوتے ہیں۔ ایسی خواہشات شاہ صاحب کے نزدیک تین ہیں:۔

۱۔ کسی اصولی نظریہ پر غور و خوض کرنے کے بعد اس کے لیے جد و جہد کرنے کی قوت صرف انسان ہی میں موجود ہے۔ وہ نقصانات اس لیے برداشت کرتا ہے اور مصائب اس لیے جھیلتا ہے کہ اسے آگے چل کر کوئی بڑا فائدہ پہنچے۔ گویا کہ کوئی نصب العین متعین کرکے اس کے حصول کے لیے کوشش کرنا صرف انسانوں کا خاصہ ہے۔

۲۔ انسان نفاست پسند واقع ہوا ہے اس میں عمدگی اور بہتری کی خواہش موجزن ہے۔ وہ بنیادی خواہشات کی معمولی تکمیل پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ خوراک ولباس اور بود و باش کی بہتر سے بہتر صورت حاصل ہوسکے۔ اس کی فطرت میں تنوع ہے۔

۳۔ انسانی فطرت میں خواص اشیاء کی تحقیق کا شوق ودیعت کیا گیا ہے۔ حیوانات اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا طریقہ فطری الہامات سے سیکھتے ہیں لیکن انسان کی رہنمائی ان الہامات کے علاوہ عقل و وحی بھی کرتی ہے۔

جن کی مدد سے وہ اپنی خواہشات پوری بھی کرتا ہے اور اس کے لیے نت نئے طریقے بھی تلاش کرتا رہتا ہے۔
مذکورہ بالا تینوں انسانی خصوصیات تعامل و تعاون کو اور بھی لازمی بنا دیتی ہیں۔ یہ بھی انسانی معاشرہ کے وجود کا باعث بنتی ہیں۔

معاشرہ کے ارتقائی منازل

شاہ ولی اللہ نہ صرف معاشرے کے ارتقاء پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ نہایت تفصیل کے ساتھ اس کی چار تدریجی منزلیں بھی متعین فرماتے ہیں۔ ان میں سے ہر منزل اسی ترتیب کے ساتھ وجود میں آتی ہے کبھی ایسا ممکن نہیں کہ بعد کی منزل پہلے اور پہلی منزل بعد میں آئے۔ البتہ پہلے درجے کی تکمیل سے قبل ہی معاشرہ دوسرے درجے میں قدم رکھ سکتا ہے۔ وہ درجے یہ ہیں:

پہلی منزل میں انسانی معاشرہ حیوانی اجتماع سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ انسان کے باہمی تعلقات نہایت سادہ اور ابتدائی قسم کے ہوتے ہیں۔ اس مرحلے میں انسان کو وہ ضروریات درپیش ہوتی ہیں جن سے ان کا چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی، اس کے جغرافیائی حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ان میں زبان، کاشتکاری، پکانے کے طریقے، برتن سازی، جانوروں کو مسخر کرنے، ان کی پرورش اور حفاظت کرنے کا فن، مکان، لباس اور شریک حیات شامل ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس مرحلہ پر بھی اجتماع چار طبقات میں بٹ جاتا ہے۔ پہلا اور اہم طبقہ عقلاء کا ہوتا ہے جو اجتماعی مصالح کی تجاویز مرتب کرتے ہیں تاکہ دوسرے ان کو عملی جامہ پہنا کر فلاح و ترقی حاصل کر سکیں۔ دوسرا طبقہ دولت مندوں اور آرام طلبوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور تیسرے میں بہادر افراد شامل ہوتے ہیں جو معاشرہ کو خارجی حملوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور چوتھے میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو شہرت اور ناموری کے دلدادہ ہوتے ہیں اور اسی جذبہ کے تحت تنگدست لوگوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ اس طرح شاہ صاحب وجودِ انسانی کے ساتھ ہی مختلف طبقات کے قیام کا تصور پیش کرتے ہیں۔

جب ابنائے آدم اپنے تمام فطری تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کر لیتے ہیں تو اجتماع ایک اور کروٹ لیتا ہے اور انسان کی مخصوص نفسیات ——— نصب العین کا تعین، نفاست پسندی اور تحقیق و تجسس ——— اس کو دوسری منزل میں داخل کر دیتی ہیں۔ اب اس کی تمامتر کوششیں اس امر کے حصول پر صرف ہوتی ہیں کہ اس کی نت نئی خواہشیں عمدہ سے عمدہ طریقے سے پوری ہوتی رہیں۔ پھر علوم کے حصول کا شوق بھی انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اس طرح بڑھتی ہوئی ضروریات اس فطری شوق سے مل کر مختلف علوم و فنون پیدا کر دیتی ہیں۔ نئی نئی ضرورتوں کے مطابق آئے دن نئے نئے تجربات کئے جاتے ہیں تو آدابِ معاش، تدبیر منزل اور معاملات کے فنون وجود میں آتے ہیں۔ گویا کہ یہ علوم و فنون کا دَور ہے۔

تیسری منزل میں بھی معاشرہ نئے نئے تجربات کے ذریعہ اور بھی نئے علوم تک رسائی حاصل کرتا ہے اور پرانے علوم جو دوسرے دور میں ایجاد ہوتے ہیں ان کی مزید حک و اصلاح کرتا ہے۔ اس دور میں تمدن وجود میں آجاتا ہے۔ ایک منظم سیاسی نظام بھی اس مرحلے میں قائم ہو جاتا ہے۔

چوتھی اور آخری منزل پر پہنچ کر معاشرہ ایک بین الاقوامی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اپنی بڑھتی ہوئی خواہشات کی تسکین کے لیے تمام چھوٹے چھوٹے "شہر" متحد ہو جاتے ہیں تاکہ باہمی جنگ وجدال انہیں تباہ و برباد نہ کرے۔ اس بین الاقوامی معاشرے کو وہ خلافت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

مملکت کا ارتقاء

شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ معاشرہ اور سیاست میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ معاشرے کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی حکومت بھی ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک معاشرہ اصل ہے اور حکومت کی حیثیت دوسری منزل کی ہے۔ سیاسی نظام بھی اجتماعی ارتقا کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا اور پیچیدگی اختیار کرتا رہتا ہے۔ پہلی منزل میں اجتماع نہایت سادہ ہوتا ہے اس لیے نظام حکومت بھی نہایت ابتدائی اور بنیادی قسم کا قائم ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر صرف ایک ایسے شخص کی ضرورت پڑتی ہے جو افراد کی ضروریات کے حصول میں مدد اور معاون ثابت ہو۔ ان کے تمام فطری تقاضوں کے لیے تسکین کا سامان مہیا کرے۔ ایک فرد کو دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے سے روک سکے۔ رفع فساد اور بقائے نسل انسانی کے لیے ایک مرد کے لیے ایک عورت مخصوص کردے۔ یہ تو گویا سردار قبیلہ کے فرائض ہوئے۔ ایسے شخص کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیئے اس کی عقدہ کشائی بھی شاہ صاحب نے فرمائی ہے۔ وہ اس میں تین صفتوں کو ضروری سمجھتے ہیں اول اصابت رائے دوم بلندی حوصلہ اور سوم قوتِ قلب۔ آگے چل کر وہ ان صفات پر چند کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ سردارِ قبیلہ میں دوسروں کو قابو میں رکھنے کا ملکہ موجود ہو۔ پھر خود درست ہو اور دوسروں کو بھی درست رکھے۔ نہایت ابتدائی قسم کے قوانین بنانے کی صلاحیت بھی اس میں پائی جاتی ہو تاکہ نزاع کی صورت میں ان کے مطابق فریقین کے درمیان تصفیہ کر سکے۔

دوسری منزل میں معاشرہ قبائلی طرز سے نکل کر شہری طرزِ حیات میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس میں اقتصادی مسائل خاصے پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ صرف بقائے نسل و نفس کے لیے تعاون و تعامل کی ضرورت نہیں رہتی اچھا کھانے اور پینے، دیدہ زیب لباس زیب تن کرنے، عمدہ مکان میں رہنے کے لیے اسے مزید اجتماعی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ انسان ضروریات کی روز افزوں ترقی اور اس میں لطافت و نفاست پیدا کرنے کی خواہش معاشرہ کے افراد کو ایک ایک پیشہ اپنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایک فرد کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ یکاو

تنہا ہی اپنی تمام لاتعداد ضروریات پوری کرے۔ وہ ایک یا چند ہی کام کر سکتا ہے اس لیے اگر کوئی کاشتکاری کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے تو کپڑے بننے پر قدرت نہیں رکھتا اور جو کپڑے تیار کرتا ہے وہ کھیتی باڑی کے کام انجام نہیں دے سکتا۔ کاشتکار کے پاس غلہ زیادہ ہے اسے کپڑے کی ضرورت ہے اور اسی طرح پارچہ باف کے پاس کپڑا اس کی ضرورت سے فاضل ہے لیکن اسے غلہ درکار ہے دونوں نے آپس میں تبادلہ کر لیا۔ اس چیز کے بدلے چیز میں بے شمار دقتیں پیش آئیں تو انسانی نظر نے معدنی اشیاء کو ذریعہ مبادلہ قرار دیا کیونکہ یہ چیزیں ضخامت میں کم ہونے کے ساتھ ساتھ مالیت رکھتی ہیں اور دیرپا ہوتی ہیں۔

پھر لوگوں نے محسوس کیا کہ ایک کام کو بھی انجام دینا ایک شخص کے لیے آسان نہیں اس لیے تیزی اور سہولت کی خاطر بہت سے آدمیوں نے مل کر کام کرنا شروع کر دیا جس سے امداد باہمی کے طریقہ کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ہی زراعت، مضاربت اور وکالت جیسی چیزیں وجود میں آگئیں۔

اس اقتصادی نظام میں جہاں ایک فرد دوسرے فرد سے اور ایک گروہ دوسرے گروہ سے بے تعلق نہیں رہ سکتا اور انہیں اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنا پڑتا ہے تو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ معاشرہ کو ایک نظام اور معمول کے تحت لایا جائے اس غرض کے حصول کے لیے قیام امن لابدی ہے تاکہ لوگ اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہیں۔ اس لیے سیاسی نظام ضروری ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ افراد کے حقوق کی حفاظت کے ساتھ ساتھ امن بھی قائم کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

اجتماع کے تیسرے دور میں ایک نہایت مضبوط سیاسی نظام کی ضرورت پیش آتی ہے جو افراد کے باہمی تنازعات کا خاتمہ کر سکے کیونکہ اس مرحلے پر پہنچ کر انسان کی فطری بہیمیت بھی ترقی کر جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حرص، بخل وحسد، اور غصب حقوق جیسے واقعات عام ہو جاتے ہیں۔ پھر ایسے لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن پر ذلیل اور ناپاک خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے اس مرحلہ پر سیاسی نظام کا فرض یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کو ان کے ناپاک ارادوں سے باز رکھے۔ شاہ صاحب کا دعویٰ ہے کہ جو قوم جس قدر زیادہ تندطبع اور تیز مزاج ہو، ہر وقت فتنہ وفساد، مقاتلہ ومجادلہ پر آمادہ رہے، دوسروں کے حقوق غصب کرنے میں بے باک ہو، اور اس سلسلے میں بخل وتشدد سے کام لیتی ہو اس قوم کو اتنا ہی سیاسی نظام کے تحت رکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ عمدہ نصب العین کا حصول بغیر قیام عدل کے ممکن نہیں اس لیے سیاست کا فرض ہے کہ عدل وانصاف کے قیام کا اہتمام کرے اور یہ بھی دیکھے کہ لوگ سماجی امور میں اس قدر محو نہ ہو جائیں کہ اپنے خالق ہی کو بھول بیٹھیں اس لیے نظام دین کی حفاظت اور دینی امور کی پابندی کے لیے

جدوجہد کرنا بھی ضروری ہے۔

مدینہ

شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ تیسری منزل پر پہنچ کر باقاعدہ مملکت وجود میں آتی ہے جسے وہ لفظ مدینہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ مملکت کے نہایت جدید مفہوم سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مدینہ سے مراد اجتماع ہے نہ کہ شہر پناہ اور قلعہ وغیرہ۔ وہ اپنی کتاب البدور البازغہ میں رقمطراز ہیں:

"جب لوگ آپس میں معاملات کریں گے اور ہر شخص کا پیشہ جدا ہوگا اور پھر ہر ایک دوسرے کا محتاج ہوگا تو تبادلہ اور باہمی تعاون کی صورتیں پیدا ہوں گی اس لیے ضروری ہے کہ انسانی جماعتوں مثلاً کاشت کاروں، پارچہ بافوں، آہنگروں، سوداگروں وغیرہ کے درمیان باہمی تعلقات ہوں۔ در حقیقت مدینہ ان ہی انسانی جماعتوں کا نام ہے جب کہ ان میں باہمی تعلق ملحوظ ہو۔ مدینہ سے مراد شہر پناہ، بازار، قلعہ یا بلند عمارتیں نہیں ہوتیں۔ اگر چند دیہات قریب قریب ہوں جن میں یہ جماعتیں رہتی ہوں اور ان سب کے درمیان لین دین اور خرید و فروخت کے معاملات جاری ہوں تو ان دیہات کو بھی مدینہ کہیں گے۔"

شاہ صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ پورا شہر اس باہمی تعلق کے باعث ایک وحدت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو جماعتوں اور خاندانوں سے مرکب ہوتا ہے۔

سلطان اور اس کے اوصاف

مدینہ کی تعریف کی وضاحت کے بعد شاہ ولی اللہ نے سیاست کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ علم جو اجتماع کے باہمی رابطہ یا تعلق کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتلاتا ہے۔ اور چونکہ شہر مختلف جماعتوں سے مرکب ہوتا ہے اس لیے یہ ممکن نہیں کہ تمام اجزاء اور افراد اپنے باہمی تعلقات میں عدل و انصاف کو پیش نظر رکھیں اور نہ ہی یہ ممکن ہو کہ قیام عدل کے سلسلہ میں ان میں سے کوئی فرد دوسرے کے غیر منصفانہ رویہ پر اعتراض کر سکے یا اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کر سکے جب تک کہ اسے کسی خاص منصب کے امتیازات حاصل نہ ہوں۔ اس لیے شہری نظم کی درستگی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کوئی شخص ایسا ہو جس کی اطاعت پر ارباب حل و عقد نے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اجتماع میں ایک بڑی تعداد اس کے قیام نظم میں معاون و مددگار ہو۔ یہی شخص سلطان ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے سلطان کے اوصاف تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ سلطان بلند اخلاق ہو جس میں نرمی کا پہلو غالب ہو اور وہ احسانات کے ذریعہ عوام کو اپنا گرویدہ بنا سکے کیونکہ احسانات محبت پیدا کرتے ہیں اور محبت کی زنجیریں لوہے کی بیڑیوں سے بھی زیادہ مضبوط

ہوتی ہیں۔ اس لیے بادشاہ اپنے عالی اخلاق، کریمانہ اوصاف، عام ہمدردی اور محبت کے ذریعہ رعایا کو یہ یقین دلادے کہ اس کی ذات ان کے لیے نعمت ہے تاکہ وہ ہر ایک کے دل میں گھر کرلے۔ وہ حلیم و بردبار ہو کیونکہ سلاطین کی تندیٔ مزاج ملک کی بربادی کا باعث ہوتی ہے۔

۲۔ شاہ صاحب بادشاہ کو نرا رحم دل اور حلیم نہیں دیکھنا چاہتے وہ اس میں شجاعت و بہادری کا وصف بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ وہ دشمنوں کا مقابلہ کرسکے اور رعیت پر رعب قائم رکھ سکے۔ شاہ صاحب بادشاہ کی شوکت کو شر پسند عناصر کی سرکوبی کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔

۳۔ وہ فارابی کی طرح تدبر، عقل و دانائی کو بادشاہ کے لیے ضروری سمجھتے ہیں تاکہ نظم و نسق میں کسی قسم کا فتور واقع نہ ہو اور وہ مملکت کی الجھی ہوئی گتھیوں کو بآسانی سلجھا سکے۔ شاہ صاحب ماوردی اور غزالی کی طرح بادشاہ کے لیے علم و فضل کو ضروری نہیں کہتے شاید ان کا خیال یہ ہے کہ اگر بادشاہ میں عملی عقل موجود ہے تو اس کا بے علم ہونا مضر نہیں۔

۴۔ بادشاہ کے لیے اعلیٰ نسبی بھی ایک اہم وصف ہے۔ شاہ صاحب کی رائے ہے کہ اگر بادشاہ کسی شریف اور اعلیٰ خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو تو رعایا کے دل میں اس کی شوکت و وقار کا پیدا ہونا ممکن نہیں جن کے بغیر امور مملکت کی انجام دہی متصور نہیں ہو سکتی۔ تاہم وہ کسی خاص خاندان کی تخصیص نہیں کرتے۔

۵۔ اپنے پیشرو مفکر ماوردی کی ہمنوائی کرتے ہوئے شاہ صاحب بھی سلطان کو جنس قوی ہی میں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ جنس لطیف پر نظم و نسق کا بھاری بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے اس سلسلے میں فرمان مصطفوی پیش کرتے ہیں۔ آپؐ نے ایرانی ملکہ کی تخت نشینی کی اطلاع پاکر ارشاد فرمایا تھا "جس قوم نے اختیارات حکومت ایک عورت کے سپرد کردیئے وہ فلاح نہ پائے گی۔"

۶۔ ولی اللہ بادشاہ کو فصیح الکلام دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ رعایا کا دل موہ لے۔ فارابی بھی رئیس اول کے لیے قوت بیانیہ کا یہ معیار بتاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہے اس کا نقشہ سننے والے کے سامنے کھنچ جائے۔

۷۔ ان اوصاف کے علاوہ بادشاہ کے حواس اور اعضا میں کسی قسم کا نقص نہیں دیکھنا چاہتے خصوصاً سماعت، بصارت اور گویائی کی سلامتی پر بہت زور دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "بادشاہ سمیع بصیر، صاحب نطق و کلام ہو۔"

سلطان کے فرائض

شاہ صاحب سلاطین کے فرائض کی ایک طویل فہرست پیش کرتے ہیں۔ کچھ فرائض انہوں نے صریحاً بیان کئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کی طرف لطیف اشارے کرکے آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہاں دونوں کی تفصیل پیش

کی جاتی ہے۔

۱۔ ان کے نزدیک بادشاہ کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ ایسے شر پسند افراد کو جو معاشرہ کے نظم ونسق کو درہم برہم کرتے ہیں اور بدامنی کا باعث بنتے ہیں ان کی سرکوبی کرے۔ قاتلوں، غاصبوں، چوروں، اتہام لگانے والوں، جادوگروں، فتنہ پردازوں، خلافِ فطرت افعال کا ارتکاب کرنے والوں کو عبرت ناک سزا دے تاکہ وہ ایسے کاموں کے اعادہ کی جرأت نہ کریں اور دوسروں کے لیے بھی عبرت ہو۔ اس کے لیے فوج رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ لیکن تعداد افواج میں افراط و تفریط دونوں کو مضر بتلاتے ہیں۔ کمی کی صورت میں فوج رکھنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اگر ضرورت سے زیادہ فوج رکھی گئی تو اس کا بار عوام پر پڑے گا جو بذاتِ خود معاشرے کی تباہی کا باعث ہے۔

۲۔ معاشرے کی اقتصادی خوش حالی بھی شاہ صاحب کے نزدیک بادشاہ کا اہم ترین فریضہ ہے۔ اس کے حصول کے طریقے بھی بتلاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جتنے بھی ناجائز آمدنی کے ذرائع ہیں جن میں ایک شخص دوسرے کو نقصان پہنچا کر دولت کے انبار جمع کر لیتا ہے مثلاً جوا۔ سود۔ رشوت۔ منافع خوری (تقی جلب)، ذخیرہ اندوزی (احتکار) کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ معاشی خوش حالی کے لیے بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ شہری باشندے بدویانہ زندگی نہ اختیار کر لیں اور نہ ہی وہ اپنی بنیادی ضروریات پر قانع ہو جائیں۔ کیونکہ ان سے معاشی ابتری پھیلتی ہے۔ بادشاہ کو چاہیئے لوگوں کے پیشوں پر کڑی نظر رکھے مثلاً کہیں بڑی تعداد میں لوگ زراعت چھوڑ کر تاجر نہ بن جائیں ورنہ ملک کا معاشی نظام بُری طرح متاثر ہو گا۔ وہ بادشاہ پر یہ بھی فرض عائد کرتے ہیں کہ تجارت پیشہ لوگوں کو اس امر پر آمادہ کرے کہ شہری ضرورت کی چیزیں کافی مقدار اور وافر تعداد میں برائے فروخت رکھیں تاکہ ملکی معاشیات پر خوشگوار اثر پڑے۔ اسی طرح ملکی پیداوار میں اضافہ کرنے کی تدابیر اختیار کرنا بھی بادشاہ کا فرض ہے مثلاً کاشت کاروں کو ترغیب دے کہ وہ زمین کو پرتی نہ چھوڑیں۔ اس طرح شاہ صاحب آج سے دو صدی قبل Grow more food کی اہمیت سے واقف تھے جس کی ضرورت کو ہم نے دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں کے بعد محسوس کیا ہے۔ اسی طرح بادشاہ کو چاہیئے صناع و اہل حرفہ افراد کو شوق دلائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ سامان تیار کریں۔

۳۔ شاہ صاحب عوام میں علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کو بھی بادشاہ کے فرائض میں شمار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ چار علوم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اول کتابت، دوم حساب، سوم تاریخ اور چہارم طب۔ ان کے نزدیک یہی علوم ہیں جو معاشرہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔

۴۔ ملک کے نظم و نسق کو صحیح طور پر چلانے کے لیے بادشاہ کا فرض ہے کہ ملکی حالات سے پورے طور سے واقف ہو۔ اس سلسلے میں وہ طوسی سے بالکل اتفاق کرتے ہیں کہ ملک میں جاسوسوں کا جال بچھا دیا جائے تاکہ مفسد اور خیر خواہ

کی تمیز ممکن ہو اور فتنہ برپا کرنے سے پہلے ہی مفسدین کی سرکوبی کی جا سکے اور جاسوسوں کا ایک اچھا استعمال بھی بتلاتے ہیں کہ ان کے ذریعہ اس بات کا بھی علم حاصل کیا جائے کہ کون لوگ محتاج ہیں تاکہ ان کی مدد کی جا سکے اور بادشاہ کو اس کی بھی اطلاع ہو کہ کون شخص کس فن میں ماہر ہے تاکہ بروقت ضرورت اس سے مدد حاصل کی جا سکے۔

۵۔ شاہ صاحب بادشاہ کو رعایا سے ٹیکس وصول کرنے کا حق دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں بے حد احتیاط برتنے کی بہت تاکید بھی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بھاری ٹیکس شہروں کو برباد کر دیتے ہیں اور حکومتوں کے زوال کا باعث بنتے ہیں کیونکہ زیادہ ٹیکسوں کی وجہ سے پیشہ ور کام سے جی چرانے لگتے ہیں۔ جس سے ملکی پیداوار کو سخت صدمہ پہنچتا ہے اور معاشرہ بجائے ترقی کرنے کے الٹے پاؤں پہلے دور کی طرف چل پڑتا ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی تھی اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ بادشاہ کا فرض ہے کہ مدنیت کی اصلاح کی خاطر تھوڑا ٹیکس عائد کرے۔

۶۔ بادشاہ کا ایک اور اہم فرض یہ ہے کہ عیش و آرام اور فضول خرچی کی زندگی نہ بسر کرے بلکہ نہایت کفایت شعاری سے کاروبارِ مملکت چلائے۔ اور عوامی خزانہ کی رقم کو بہت احتیاط سے خرچ کرے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حکومتوں کے زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ خزانہ سے مفت خوروں کو بغیر استحقاق بڑی بڑی تنخواہیں ملنے لگتی ہیں۔ مصنوعی غازیوں، زاہدوں اور شاعروں پر رعایا سے وصول کردہ رقم پانی کی طرح بہائی جاتی ہے۔ اسی لیے وہ بادشاہ کو تاکید کرتے ہیں کہ خود بھی فضول خرچیوں سے باز رہے ورنہ اس کی سلطنت تباہ ہو جائے گی۔ وہ قیصر و کسریٰ کے اسراف کا ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں " قوم کے اکابر اس جد و جہد میں مشغول ہو گئے کہ اسبابِ تعیش میں وہ دوسرے سے سبقت لے جائیں حتیٰ کہ امراء اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکا یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو یا ان کے پاس عالیشان سر بفلک محل نہ ہوں جس میں پانی کے حوض، سرد و گرم حمام، بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زیادہ نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں، حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبو سے شرابِ ارغوانی چھلک رہی ہو "

۷۔ شاہ صاحب بادشاہ کے فرائض میں یہ بھی شمار کرتے ہیں کہ وہ راعی اور رعایا کے تعلقات خوشگوار بنائے اور کسی قسم کے اختلاف کو راہ نہ پانے دے۔ لیکن کسی وقت دونوں میں غلط فہمی پیدا ہو یا کوئی اختلاف رونما ہو جائے تو بھی بادشاہ کا فرض ہے کہ لطف و احسان سے اس کا تدارک کر دے اور اپنی خیر خواہی کے ذریعہ رعایا کی غلط فہمی کو رفع کر دے۔ وہ دلوں کو مسخر کرنے کا طریقہ یہ تجویز کرتے ہیں کہ بادشاہ کو شکاریوں کا طرز اپنانا چاہیئے جس طرح تجربہ کار صیاد وحشی جانوروں پر قابو پانے کے لیے ان کی عادات سے واقفیت حاصل

کرکے ایسا رویہ اختیار کرتا ہے کہ وہ اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ نغمہ سرائی سے کام لیتا ہے اور کبھی ان کی مرغوب چیزیں دے کر انہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب یہ وحشی جانور بھاگنے لگتے ہیں تو وہ رک جاتا ہے اور جب وہ ٹھہر جاتے ہیں تو صیاد ان کی طرف چلنا شروع کر دیتا ہے اور آخر کار ان کو اپنے دام میں جکڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بادشاہ کا بھی فرض ہے کہ رعایا کے لیے اپنی خیر خواہی کا اظہار کر کے انہیں اپنا رام بنا لے۔

۸۔ وہ بادشاہ کا فرض یہ بھی بتلاتے ہیں کہ وہ امور مملکت کی انجام دہی میں تساہل نہ برتے اور کام کو بروقت اور پابندی کے ساتھ کرے جو چیز آج کرنی ہے اسے کل پر ہرگز نہ چھوڑے۔ (باقی)

پاکستان کے بلند پایہ مفکر اور نامور مصنف

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

بانی ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی یاد میں ادارہ کے ترجمان

مجلہ "ثقافت"

کا

خلیفہ عبد الحکیم نمبر

عنقریب شائع کیا جائے گا جو خلیفہ صاحب کی ثروتِ افکار، علمی فضیلت اور دینی خدمات نیز ان کی دل کش اور ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والے مضامین کا ایک نادر مرقع ہوگا۔ مرحوم خلیفہ صاحب کے احباب اور قدر شناس نہ صرف پاکستان و ہندوستان بلکہ مشرقِ وسطیٰ، یورپ، امریکہ اور مشرقِ بعید کے مختلف ممالک میں بھی موجود ہیں۔ اور یہ خاص نمبر ان کے مقالات و تاثرات پر مشتمل ہوگا۔

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور